بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(۱)

رسالہ ترجمان القرآن جس کے کاغذی مدرسہ سے میں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۷۸ء تک ایک ادنیٰ طالب علم کی مانند مسلسل سبق لیا ہے، اس کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ میں آہستہ آہستہ اُس اُمیت کے تاریک غار سے نکل آیا جس میں بے شمار ڈگریاں اور سندات رکھنے والے بھی ساری عمر گھرے رہتے ہیں۔ اس مدرسہ میں میرے اُستاذِ اعلیٰ اب تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی چلے آ رہے ہیں۔ آج میں اپنی موجودہ ایمانی و فکری سطح سے جو میرے بہت سے ہم مکتبوں سے فروتر ہے، اپنے سابق مقامِ تہی دامنی و فرومائیگی سے ذرا جھک کر دیکھتا ہوں تو اس طرح کانپ جاتا ہوں جیسے کسی بلند مینار پر چڑھ کر کوئی شخص نیچے دیکھتا ہے تو ہول کھاتا ہے۔ پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں اسی تاریک گڑھے میں رہ گیا ہوتا تو بڑے سے بڑا مالی مفاد، شاندار ترین دنیوی رتبہ، اسبابِ آسائش و آرائش کے انبار، ادبی یا سیاسی یا دینی دائرے میں مصنوعی طریقوں سے حاصل کردہ شہرتِ عام، ملکی اور بین الاسلامی اور بین الاقوامی سطحوں پر حاصل ہونے والا وقار، کوئی بھی چیز میری بدنصیبی کی تلافی نہ کر سکتی۔

ترجمان القرآن کو میری نگاہ میں ہمیشہ ایک ادب گاہ کی حیثیت حاصل رہی ہے کہ اس کی مجلس میں آدمی خاموشی سے داخل ہو اور کسی کونے میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کرے۔ ایسے مجلّہ کا قاری ہونا ہزار گونہ موجب سعادت ہے۔ مگر اس کی ادارت کی مسند پر بیٹھنے کا خیال آدمی کی تمام ایمانی و فکری کمزوریوں کو اس کے سامنے آراستہ کر دیتا ہے۔ یہ چھری کے بغیر ذبح (ذبح بغیر سکین) ہونے والی صورت ہے۔

۱۹۴۸ء میں صاحب ترجمان القرآن اور ان کے ساتھ علم و تقویٰ رکھنے والے دو رفقاء کی سیکورٹی ایکٹ

کے تحت نظر بندی نے ایک ایسی حالتِ اضطرار پیدا کر دی کہ صاحبِ ترجمان القرآن نے اپنی رائے یہ دی کہ ترجمان القرآن کو بند کر دیا جائے، پھر جب حالات سازگار ہوں گے تو از سرِ نو دیکھا جائے۔ مگر اپنے ان کے اہل الرائے حضرات جمع ہوئے اور انھوں نے مجھ میں اعتماد کو ابھار کر اس پر آمادہ کر لیا کہ اب اس سفینۂ علم کو اپنے قلم سے کھینے کی ذمہ داری مجھے لینی ہے۔ اور میں نے اس جذبے سے کہ اپنے محاذ پر کسی بھی خالی شدہ جگہ کو خالی رکھ کر کسی کو یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ بس سارا کھیل دو چار افراد کا ہے۔ جن میں جسے بھی اس کی جگہ سے ہٹا دیا جائے، کوئی نہ کوئی کام بند ہو جائے گا، اپنی استعداد سے زیادہ گراں ذمہ داری کے لیے اپنے کندھے پیش کر دیے۔ غالباً یہ سلسلہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رہائی (۱۹۵۰ء) تک جاری رہا۔ ہمت افزائی کرنے والے محبتوں نے میری اس دور کی مساعی کی قدر افزائی کی۔ خاص طور پر یہ امر میرے لیے بہت سرمایۂ تسکین ہوا کہ خود صاحب ترجمان القرآن نے میری خدمات کے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے، اور الفاظ کے بغیر بھی میں مولانا کی نگاہوں اور ان کی پیشانی سے ان کے تاثرات پڑھ سکتا تھا۔

اس دورِ کار کی ایک خاص پیچیدگی یہ تھی کہ مجھے مرکز کی جملہ سرگرمیوں اور مشاورتوں میں بھی حصہ لینا ہوتا تھا، شہر لاہور کی جماعت کے اجلاسوں اور شہر میں ہونے والی دعوتی سرگرمیوں سے بھی پوری طرح دلچسپی رکھنی ہوتی تھی، پھر پاکستان بھر میں وقتاً فوقتاً دورے کر کے جلسوں میں تقاریر بھی کرنی ہوتی تھیں۔ اور لکھنے کا عالم یہ تھا کہ ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے اخبار میں صحافیانہ شذرے الگ لکھتا، اور ماہنامہ چراغ راہ کو بہ حیثیت ادبی مجلّے کے شروع سے آخر تک مرتب کرتا اور بہت سا حصہ خود لکھتا، نظم بھی اور نثر بھی، مقالات بھی اور کہانیاں بھی۔ اس سارے ہنگامے کے سامنے ساتھ ترجمان القرآن کی ادارت اس طرح کرتا کہ جونہی میں ترجمان القرآن کے لیے قلم اٹھاتا میرا سارا ذہنی دروبست ایک نئی ترتیب اختیار کر لیتا۔ بعض لوگوں نے اس زمانے میں مجھ سے سوال بھی کیا کہ متعدد دائروں میں بیک وقت کام کرتے ہوئے ہر دائرے کا اندازِ کار اور اسلوب بیان کیسے تبدیل کر لیتے ہو۔ جیسے بجلی کا ایک بٹن دبایا تو لیمپ روشن ہو گیا، دوسرا دبایا تو پنکھا چل پڑا۔ حسبِ موقع کچھ جواب دے دیتا اور دل ہی دل میں کہتا کہ یہ مداری کا ایک کھیل ہے کہ وہ ایک کوری کاپی کی ورق گردانی کر کے حاضرین کو دکھاتا ہے، پھر جب وہ دوسری بار وہ اسے کھولتا ہے تو جہاں سے کھولتا ہے نقاشی اور

گل کاری کے نمونے سامنے آتے ہیں، پھر بند کر کے تیسری بار کھولتا ہے تو جو بھی ورق اُلٹتا ہے اس پر خوش خط مثنوی لکھی نظر آتی ہے، کبھی تمام صفحات پر انگریزی مضمون چھپا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ امر حقیقی آج بھی یہ ہے کہ میرے ذہن میں دینی مباحث، ادبی افکار، صحافیانہ نوٹس، فلسفیانہ نظریات، نظموں، غزلوں اور نعتوں کے الگ الگ خانے اس طرح سے بنے ہیں جیسے کسی الماری کے ہوتے ہیں جس طرح کا کام سامنے آتا ہے، اسی کے مطابق ایک خاص خانے کو کھول کر اس میں سے فائیل نکال لیتا ہوں اور کام شروع کر دیتا ہوں۔ تقریروں میں بھی، علمی تقریریں، سیاسی تقریریں، مساجد کی تقریریں اور تعلیم گاہوں کی تقریریں میرے ہاں بالکل الگ الگ اسٹائل پر مرتب ہوتی ہیں۔ خدا کے فضل سے یہ رنگا رنگی کچھ نہ کچھ آج بھی قائم ہے۔ کوئی گھر بند نہیں! یہ محض خدا کی عنایت ہے، میرا کیا کمال!

اپریل ۱۹۵۰ء میں جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ملتان جیل سے رہا ہوئے تو موصوف کی رہائی کے چند ہی دن بعد میں نے ترجمان القرآن کی مجبورانہ ادارت سے سبکدوش ہونے کی درخواست بہ اصرار پیش کی، اور منظوری ہو گئی۔ خدا جانے یہ خیال کیسے میرے ذہن میں آیا کہ اسی وقت سے برادر مرحوم پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب نے میری خالی کردہ جگہ کو پُر کیا۔ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ اس زمانے میں خود صاحبِ ترجمان القرآن ہی نے از سرِ نو ادارت سنبھال لی۔ پروفیسر صاحب کی تحریریں کبھی کبھی ادھر شائع ہوتی رہیں۔ مولانا محترم نے کام کی زیادتی کی وجہ سے ۱۹۵۸ء میں صدیقی صاحب کو ترجمان القرآن کی ادارت تفویض کی۔ شروع میں وہ میری طرح متوسط درجے کا کام کرتے رہے، لیکن مطالعہ و کاوش کے بل بوتے پر انھوں نے تیزی سے ترقی کی۔ پچھلے دو چار سال سے وہ جس معیار کے ساتھ اشارات لکھ رہے تھے، جو تفکر ان کی تحریروں میں کام کرتا تھا اور ہر قسم کے حالات میں جس واشگاف انداز سے وہ اظہارِ حق اور اعلان کرتے تھے۔ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر میرے لیے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ میں اب کبھی ترجمان القرآن کی ادارتی ذمہ داریوں میں شریک ہوں گا۔ ترجمان القرآن کے لیے جو خانہ دماغ کی الماری میں کبھی مقرر کیا تھا، بند پڑے پڑے اس کے قفل اور قبضوں میں زنگ لگ چکا تھا۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی بیماری کے دوسرے شدید دور میں جب کہ ان کے لیے لکھنا یوں بھی ممکن نہ تھا اور معالج کی طرف سے کچھ پرہیز بھی لازم کیا گیا تھا، صاحب ترجمان القرآن کی طرف سے اشارہ ہوا

کہ اس وقفے میں عارضی طور پر میں کم سے کم اشارات لکھ دیا کروں۔ امتثالِ امر کے لیے اشارات کے صفحات کو ٹیڑھی لکیروں سے بھر دینے کا عمل شروع کر دیا۔ اِسی دوران میں صدیقی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان کا جنازہ پڑھ آنے کے بعد تک بھی مجھے یہ اندیشہ کبھی لاحق نہیں ہوا کہ ترجمان القرآن کی کوئی ذمہ داری مجھے اُٹھانی ہوگی۔ اِس کا حکم بھی اچانک ہی ملا۔ اور تحریکِ اسلامی کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں ایک اہم خدمت سے محض اس لیے فرار کروں کہ میری نگاہ میں میرا کام ویسا نہیں ہو سکتا تھا جیسا ہونا چاہیے تھا۔

میں اس موقع پر وہی بات کہتا ہوں جو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق کہی تھی کہ اے ابوبکر تم نے اس کام کو اپنے بعد والوں کے لیے مشکل تر بنا دیا۔ سو صدیقی صاحب کام کو ہمارے لیے زیادہ مشکل بنا گئے۔

عجیب بات ہے کہ میری ساخت اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہے کہ میں ہمیشہ بے مزد کام کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں۔ خصوصاً دینِ برحق یا تحریکِ اسلامی کی کوئی خدمت مجھ سے انجام پا سکے تو میری روح کی حقیقی مسرت اس صورت میں ہوتی ہے کہ کسی تنخواہ یا وظیفے کے بغیر جو کچھ بن آئے کرتا رہوں۔ دین یا تحریک تو بڑی چیز ہے، میں نے اگر اخبارات و رسائل میں کچھ لکھا تو بسا اوقات پیشکش ہونے کے باوجود کچھ لینا پسند نہیں کیا۔ کسی سے میں نے از خود کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ ہاں اکا دکا دوست ایسے بھی نکلے جنہوں نے از خود کبھی کبھار تھوڑا بہت احسان کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بے نیازانہ مسلک کے لیے ایک جائیداد چاہیے یا مسلسل آمدنی دیتے رہنے والا کاروبار۔ یہ معاملہ اپنے ہاں صفر کے گول دائرے کے جوفِ خالی سے آگے نہیں بڑھا۔ مجبوراً گذر بسر کی راہیں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔ بایں ہمہ جب معاوضے پر کام کرنے کا معاملہ آتا ہے تو گویا میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، اور دماغ کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ بہرحال ناشکرے پن سے خدا محفوظ رکھے اور کسی تعمیری و فلاحی خدمت کے ذریعے وہ اگر حلال روزی دے تو حرام خوری کے اِس دور میں اُس کی بڑی عنایت ہے۔ ہم جیسے کمزور لوگ فاقہ مستی کو بھی تو سہ نہیں سکتے۔ ایسا ایک ہفتہ گزارنا پڑے تو سب کچھ زیر و زبر ہو جائے۔

اب جب کہ یہ ذمہ داری میرے حصے میں آگئی ہے اور میں اپنے سے بہتر کسی آدمی کے سامنے آنے تک

اسے نبھانے کی کوشش کروں گا، میرا جی چاہتا ہے کہ امکانی حد تک ایسی بہترین خدمات انجام دے سکوں جو اس موقر مجلے کے شایانِ شان ہو۔ یہ مجلہ جس نے بے شمار افرادِ ملت اور خصوصاً نوجوانوں کی زندگیوں کا نقشہ بدل دیا ہے۔

ہم جس نازک دَور میں سے گذر رہے ہیں، وہ باطل کی ترکتازیوں کے عین درمیان تحریکاتِ اسلامی کے اُبھرنے کا دَور ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خونخوار حملوں اور سازشوں اور مکاریوں کا دَور ہے۔ الحاد اور مادہ پرستی پر مبنی تہذیب مختلف نظاموں کے پیرایوں میں اپنے لاینحل تضادات کے درمیان بے بسی کے ساتھ گھری کھڑی ہے۔ ان تضادات کا اب کوئی حل سوائے اس کے نہیں کہ یہ زندگی کے ہر گوشے میں تصادم پیدا کریں اور موجودہ نقشہ تمدن درہم برہم ہو جائے۔ درحقیقت دَورِ نو کی شکست کا آغاز ہو چکا ہے۔ لیکن باطل مرنے سے پہلے زخمی سانپ کی طرح ہر اس زندہ وجود کو ڈس لینا چاہتا ہے جو سانپ نہیں ہے۔ چنانچہ اسلامی تحریکات کے خلاف دُنیا میں بڑے بڑے اژدر پھنکار رہے ہیں اور مسلمانوں کی نیش زنی کے لیے ایک نہ ایک سنپولیا بس گھول رہا ہے۔

خود پاکستان میں ایک طرف اسلامی نظامِ حیات کی طلب نیچے کی دعوتی سطح سے اُمڈ کر اُوپر کی سیاسی سطح تک آگئی ہے، اور دوسری طرف مغربی، اسرائیلی اور سوشلسٹ قوتیں نہ صرف اس کا رستہ روکنا چاہتی ہیں بلکہ سرے سے اس رجحان ہی کو ملیا میٹ کر دینا چاہتی ہیں۔ ایک مزاحمت اسلامی تحریکات کے خلاف ہو رہی ہے اور دوسری شقاوت جگہ جگہ مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہے، کیونکہ ان سے اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ ان کا وزن اسلامی تحریکات کے پلڑے ہی میں جاتا ہے۔

مگر بظاہر قدرت کا نقشہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالات کی سنگین ناخوشگواریوں کے باوجود اسلام کو اُبھار کے اُوپر لانا چاہتی ہے ——— اسی طرح جیسے فرعون کے گھر میں موسیٰ پروان چڑھے تھے۔

میرے سامنے یہ پیچیدہ احوال پوری طرح واضح ہیں۔ اور میں پہلے بھی جو کام جس دائرے میں کر رہا ہوں اسی جذبے سے کر رہا ہوں کہ اسلام کا بول بالا ہو، اور اب ترجمان القرآن کے ذریعے جو خدمت انجام دینے کا موقع مجھے نصیب ہوا ہے اسے بھی میں اسی مقصد کے لیے کام میں لانا چاہتا ہوں کہ لیقوم الناس بالقسط۔

میں چاہتا ہوں کہ صاحبِ ترجمان القرآن، دفتر ترجمان القرآن کے کارکن، جماعتی عمائد اور کارکن اور رسالہ کے قارئین سبھی میرے لیے دُعا کریں کہ میں خلوص اور قابلیت سے اس مشن کو پورا کر سکوں جیسے میں نے اجمالاً عرض کیا ہے۔ تمام توفیق اور نصرت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

(۲)

دورِ حاضر کی قبا پر ذلّت کا ایک اور سیاہ تمغہ آویزاں ہو گیا۔

برما کی سرزمین جہاں اسلام کی ابتدائی کرنیں فتح سندھ و ہند سے بھی پہلے پہنچ گئی تھیں، وہاں مسلمان ایک بڑی تعداد میں مدّتِ دراز سے آباد تھے۔ انہوں نے جہاں اس سرزمین سے معاش حاصل کی، وہاں برما کی اقتصادی بہبود کے ساتھ ساتھ علمی، فکری، اخلاقی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے اس کی ترقی میں بھی حصّہ ادا کیا۔ شریف و معزز قومیں نسلی اور مذہبی امتیازات کے بغیر ہر کسی کی تعمیری خدمات کی قدر کرتی ہیں۔ جہاں تک ہماری عام معلومات کا تعلق ہے، برما کے مسلمان نہ تو کسی بغاوت سے کبھی ملوث ہوئے، نہ وہ جرائم کیش تھے کہ اُن کے خلاف حکومت من الحیث الجماعت کوئی تباہ کن اقدام کرنے میں برسرِ حق ہوتی۔

کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ برما کے بودھوں نے اشتراکی اثرات کے تحت اقتدار کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اختصاصی طور پر مسلمانوں کی مذہبی کمیونیٹی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے۔ شہریوں کی ایک اقلیت کے خلاف حکومت کی طرف سے ایک ایسی کارروائی کا ہونا جس کا مقصد اور عملی نتیجہ ان کو تہس نہس کرنا اور ملک کے حدود سے ان کو نکال کر باہر کرنا ہو، اس دور کی اقوام کے دستوری اعلانات و روایات اور ادارۂ اقوام متحدہ کے بنیادی چارٹر کے خلاف ہے۔

کیا جواب ہے بودھوں کے پاس اس سوال کا کہ کیا تمہارا بدھ مت انسانوں کے ساتھ اور خصوصاً تمہارے ساتھ برسوں مل کر رہنے والی اقلیتوں کے ساتھ ایسے ہی سلوک کی تلقین کرتا ہے، کیا تمہارے مہاتما بدھ کی میراث نفرت اور تشدد ہے؟ کیا میدانِ جنگ اور عدالتی دائرے سے باہر انسانی جانوں کا اتلاف جائز ہے؟ کیا آباد گھروں کو اجاڑنا کوئی معقول حرکت ہے؟

دو ڈھائی لاکھ افراد کا اس حالت میں بنگلہ دیش کی سرحد کے اس پار دھکیل دینا کہ ان کے مکانوں اور دکانوں کو جلا دیا گیا ہو، ان کے سامان لوٹ لیے گئے ہوں، ان کے بے شمار افراد گولیوں سے بھون دیے گئے ہوں، ہزاروں عورتوں کے ناموس درندگی کا شکار ہو گئے ہوں، معصوم بچوں تک کے خون سے برما کی زمین کو رنگین کر دیا گیا ہو، نوجوانوں کو گرفتار کر کے سڑکوں کی تعمیر کرانے کے لیے بیگار میں لگا دیا گیا ہو،

اور خوف و ہراس کے اس عالم میں ۵۰ لاکھ مسلمانوں کی پوری آبادی ذہنی طور پر اکھڑ چکی ہو اور ہر فرد اور ہر گھرانا اسی سوچ میں ہو کہ وہ کب کدھر سے ہو کر کہاں چلا جائے، تو اس ساری صورتِ حالات کو برما کی حکومت کے ایک سنگین مجرمانہ فعل کا آئینہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ دیش خود کثیر آبادی کا ایک محدود الوسائل ملک ہے اور مغربی پاکستان سے الگ ہونے کے بعد وہ ابھی تک اچھی طرح اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو پایا کہ اس کے سر پر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا گیا ہے[1]۔ وہاں جو ہزارہا افراد پہنچ چکے ہیں اور جن کی آمد ایک قطارِ مسلسل کی صورت میں (تقریباً ۵ ہزار افراد روزانہ) جاری ہے۔ ان کے لیے سر چھپانے کے انتظامات کیے جا رہے ہیں (درآنحالیکہ شدید بارشوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے) جو ابھی بہت محدود اور بہت ناقص شکل میں ہیں، ان کے لیے غذا کی فراہمی کے علاوہ پینے کے صاف پانی کی رسد کا بھاری مسئلہ حل طلب ہے، پھر اس بے گھر آبادی میں سے بھوک پیاس، نمونیے اور ہیضے سے مرنے والوں کی ایک کثیر تعداد نے دوا علاج کے معقول انتظامات کی اہمیت واضح کر دی ہے۔ یہ سارا بوجھ اٹھانا بنگلہ دیش کے بس کا روگ نہ تھا، غنیمت ہے کہ بین الاقوامی سطح پر حرکت شروع ہو گئی ہے، اور قابلِ رشک مثال ہے کہ اسلامی سیکریٹیریٹ کی طرف سے ۸ لاکھ ڈالر کی امداد دی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود تارکینِ وطن کا ایک تہائی حصہ کچھ عرصے میں ختم ہو جائے گا۔ جو زندہ رہیں گے وہ بھی انتہائی تکلیف دہ حالات میں رہیں گے جیسا کہ دنیا میں کیمپوں کی (باقی اشارات بر صفحہ ۲۹)

[1] در حقیقت یہ ایک پر اسرار معاملہ ہے۔ کبھی کبھی کسی آبادی کا ملک بدر کرنا یا اس کا ہجرت کرنا بڑے بڑے حوادث کا باعث بنتا ہے۔ سابق مشرقی پاکستان سے کچھ صحیح اور کچھ غلط طور پر جو آبادی انڈیا گئی تھی۔ اسے انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملے کا سبب بنا لیا۔ اب معاملہ اُلٹ ہے۔ اگر بنگلہ دیش برما سے سخت رویہ اختیار کرے تو برما کے پردے کے پیچھے سے اسی طرح کی کوئی اور قوت نکل آئے گی۔ جیسے انڈیا کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص منصوبے کے تحت یہ سارا ہنگامہ کھڑا کیا گیا ہو۔ افغانستان میں فوجی انقلاب، ایران میں مخالفِ حکومت ہنگامے، بنگلہ دیش میں برما سے نکالے ہوئے مسلمانوں کا مسئلہ اور پاکستان میں بھٹو کیس کے پیدا کردہ بحران کے شاخسانے، ایشیا کے ان غیر اشتراکی ممالک میں واقعات کی آپس میں ملی ہوئی کڑیاں ہیں یا محض اتفاق ہیں۔

(بقیہ اشارات) آبادیاں رہتی ہیں - وہ فلسطینی مہاجروں کے کیمپ ہوں، بنگلہ دیش میں بہاری یوں یا غیر بنگالیوں کے کیمپ ہوں یا برما کے وطن بدر کردہ مسلمانوں کے کیمپ ہوں، ان میں رہنے والے بحالِ نزار ہی رہ سکتے ہیں - کم غذا اور کم لباس کے ساتھ ان کو گذر بسر کرنی ہوگی اور شرافت اور شرم و حیا کی بہت سی روایات سے وہ محروم ہو جائیں گے - پھر دنیا ابتدار میں جو توجہ ادھر دے گی، وہ ہمیشہ باقی نہ رہے گی بلکہ اور کتنے ہی واقعات ایسے رونما ہوں گے جن کی ریڈ کراس اپیل کرے گی اور اقوام عالم کا رُخ اُدھر کو پھر جائے گا - لاکھوں کی تعداد میں بے وطن لوگوں کا کوئی بھی ہجوم جسے کوئی مستقل ٹھکانہ اور ذریعہ معاش نہ ملے، کسی قارون کی خیرات پر تادیر زندہ نہیں رہ سکتا - یہ ایک بڑی شرمناک کارروائی ہے جو حکومت برما نے کی ہے اور اس کے ملک بدر کردہ لاکھوں افراد کے موجودہ اور آئندہ کیمپوں کا وجود انسانیت کی توہین، اقوام عالم کے لیے آزمائش اور خود برما کے لیے تمغۂ ذلت ہے۔

حکومت برما کا کہنا ہے کہ ہم نے تو صرف ناجائز طور پر ملک میں آنے والے لوگوں کے متعلق کارروائی کرنے کے لیے برما کی قدیم آبادی کی رجسٹریشن کی چیکنگ کا آغاز کیا تھا جس پر چیکنگ سے بچنے کے لیے ملک میں ناجائز طور پر آنے والے مسلمانوں کی بھاری تعداد بھاگ کھڑی ہوئی - صفائی کے اس بیان کو سن کر ہم پوچھتے ہیں کہ اوّل تو ملک بدر کردہ مسلمانوں میں سے کئی لوگوں نے اپنی رجسٹریشن اور زمینوں اور مکانوں کی رجسٹریاں دکھائی ہیں - لیکن فرض کیجیے کہ سب کے سب برما کے ناجائز شہری تھے - اس صورت میں یا تو ان کے خلاف عدالتی کارروائی کی جانی چاہیے تھی، عدالت ان کے حالات اور کاغذات کی جانچ پڑتال کرتی اور کسی کو ناجائز شہری پاتی تو اسے سزا دیتی یا ملک سے باہر چلے جانے کا حکم سناتی - یا پھر اگر انتظامیہ اور فوج کو خود ہی اقدام کرنا تھا تو سیدھی طرح لوگوں کو گرفتار کر کے گروہ در گروہ سرحد کے پار پہنچا دیا جاتا - اس میں لوگوں کو قتل کرنے اور خواتین کو بے آبرو کرنے، معصوم بچوں کی جانیں لینے، نوجوانوں کو بیگار کے لیے گرفتار کرنے اور مسلمانوں کے مکانوں اور دکانوں کو لوٹنے کے بعد جلانے کا جواز کیسے نکل آیا؟

خیر اب جبکہ حکومت برما مسلمانوں کے متعلق اپنا گندا اعمال نامہ سامنے لا چکی ہے، اقوام متحدہ کے ذریعے تین کام ہونے چاہییں:

ایک یہ کہ جو لوگ سرحد کے پار آ چکے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کا تفصیلی بیان لے کر ایک مجموعی رپورٹ

تیار کی جائے۔ اور یہ رپورٹ مع بیانات کے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سامنے رکھی جائے۔ ساتھ ہی حکومت برما سے یہ بات تسلیم کروائی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کے کسی وفد کو جس میں دو ایک مسلمان ملکوں کے نمائندے بھی شریک ہوں (کیونکہ سارا قضیہ مسلمانوں کے متعلق ہے) ۔ برما میں جا کر حالات کی تحقیق کریں ...... یہ لوگ پبلک سے معلومات حاصل کر کے تھانوں، جیلوں اور ہسپتالوں کا معائنہ کریں کہ قریبی عرصہ میں کن مسلمانوں کو کن الزامات میں پکڑا گیا ہے اور ہو سکے تو ایسے افراد سے مل کر ان کی سرگذشتوں کے نوٹس لیں اور اندازہ لگائیں کہ انسانی حقوق کے متعلق اقوام متحدہ کے چارٹر کی پامالی کس کس شکل میں ہو رہی ہے۔

ان رپورٹوں کی بنا پر اقوام متحدہ کے سامنے حسب ذیل بنیادوں پر سارا کیس اٹھایا جانا چاہیے:-

۱۔ حکومت برما نسل کشی کی مجرم ہے۔

۲۔ حکومت برما حقوقِ انسانی کے بین الاقوامی چارٹر کی بہت بڑے پیمانے پر خلاف ورزی کی ہے۔

۳۔ حکومت برما نے ایک پُر امن اقلیت پر کوئی متعین الزام لگائے بغیر اور عدلیہ کے سامنے معاملہ رکھے بغیر قانون نافذ کرنے والی قوتوں کو غیر قانونی طریقہ ہائے ظلم و تشدد سے کام لیا ہے۔

اس بحث کے نتیجے میں جب صورتِ حالات نکھر کر سامنے آجائے تو پھر مطالبات یہ ہونے چاہییں کہ تمام تباہ کردہ یا سلب کردہ جائیدادوں کی قیمت ادا کی جائے، قتل اور عصمت دری کے تمام واقعات پر خوں بہا اور تاوان ادا کیا جائے اور برمی مسلمانوں کو ان کی اصل جگہوں پر آباد کیا جائے۔

حکومت برما اگر ایسا نہ کرے تو اقوام متحدہ کا یہ اصولی فرض ہے کہ وہ اپنے فوجی دستوں اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کو وہاں لے جا کر قوت سے ضروری فیصلوں کی تعمیل کرائے۔ بغیر اس کے اس کے اعلامیوں اور بنیادی حقوق کے چارٹر کی آبرو سلامت نہیں رہ سکتی۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسلامی سیکرٹریٹ نے بھی برما سے ملک بدر ہونے والے اور حکومت کی طرف سے مظالم کا نشانہ بننے والے مسلمانوں کے معاملے پر بھرپور توجہ دی ہے۔ سیکرٹریٹ کا ایک وفد بنگلہ دیش میں مہاجرین کے حالات کو سمجھنے کے لیے جا چکا ہے۔ وہ وفد برما میں بھی جانا چاہتا ہے، تاکہ مسلمانوں کے

احوال کو بچشم خود دیکھ سکے اور افراد اور اداروں سے معلومات جمع کر سکے۔

یہ کام جلد مکمل ہونا چاہیے اور رابطہ عالم اسلامی حکومتِ برما سے مسلمانوں کے بارے میں تحفظ اور امن کی ضمانت حاصل کرے۔ اگر حکومت برما تلافی پر آمادہ نہ ہو تو اس کے بحری جہازوں کے لیے تمام مسلم ممالک کی بندرگاہیں، اس کے طیاروں کے لیے ہوائی اڈے بند کر دیے جائیں۔ اس کے اموال کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس کے غیر مسلم افراد کو کسی مسلمان ملک میں آنے یا اس کا ویزا حاصل کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ تمام تجارتی اور سفارتی تعلقات ختم کر دیے جائیں۔ مسلم ممالک کا تیل برما کو نہ براہ راست حاصل ہونا چاہیے نہ بالواسطہ طور پر۔ برما کے حق میں خبری مواد یا پروپیگنڈا مسلم ممالک کے اخباروں (یا ریڈیو اور ٹیلی وژن) میں جگہ نہ پا سکے، بلکہ غیر مسلم ممالک کے مسلم اخبارات بھی یہی پالیسی اختیار کریں۔ کسی بین الاقوامی ادارے یا کھیل کے عالمی مقابلوں میں بھی برمیوں کا وجود گوارا نہ کیا جائے۔ اقوام متحدہ یا کسی دوسرے عالمی اجتماع میں برما کا مندوب جب تقریر کرے تو تمام مسلمان مندوبین احتجاجاً واک آؤٹ کر جائیں۔

بہتر ہے کہ یہ فیصلہ جولائی میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں طے پائے، اور فی الوقت اس کے لیے مسلمان حکومتوں کے اکابر و عمائد کو تیار کیا جائے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ پورے عالم اسلام میں یومِ مظلومینِ برما کسی مقررہ تاریخ کو منایا جائے اور اس دن تمام کاروبار بند رکھے جائیں۔

جب تک کسی ملک کی مسلم اقلیت کو نشانۂ ظلم بننے سے بچانے کے لیے ایک بار اس درجے کا اقدام نہ کیا جائے گا، بار بار دنیا کے مختلف گوشوں کی غیر مسلم حکومتیں اسی طرح مسلم کشی کرتی رہیں گی جیسے کہ وہ کرتی چلی آرہی ہیں۔

جا بجا ہمارے لاکھوں بھائی ظلم کی چکی میں پستے ہیں اور ہم چند تقریروں اور بیانوں اور قراردادوں میں اپنا رونا رو کر سمجھتے ہیں کہ اخوت اسلامی کا حق ادا ہو گیا۔

اتنی بڑی جوابی کارروائی کے لیے شاید یہ مناسب ہو گا کہ ہر مسلم ملک میں خاص کانفرنسیں منعقد ہوں جن کو قومی کانفرنس برائے انسدادِ مظالمِ حکومتِ برما" جیسا نام دیا جائے۔ درمیانی وقفے میں اگر دو ورقوں اور چہار ورقوں میں برما کے مظلوم مسلمانوں کے احوال شائع کر کے گھر بہ گھر جا کر چندہ جمع کیا جائے اور نقدی کے ساتھ ساتھ سامانِ غذا، پارچات، دوائیں، کمبل، خیمے وغیرہ

بھی بنگلہ دیش پہنچنے والوں کے لیے روانہ کیے جائیں تو یہ ساری سرگرمی جہاں مظلوموں کی ٹھوس مدد کا ذریعہ ہو گی، وہاں حکومت برما کے ظالمانہ اقدام کو بھی دُنیا کے بچے بچے کے سامنے آشکارا کر دے گی۔ اس سلسلے میں ہر مسلمان ملک کے اخبارات کو خاص نمبر شائع کرنے چاہئیں، ہر جگہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر جلسے ہونے چاہئیں۔ جہاں ممکن ہو وہاں حکومت برما کی ظالمانہ کارروائی کے خلاف جلوس نکلنے چاہئیں۔ برمی سفارت خانوں کے سامنے ہر مسلم ملک میں احتجاجی مظاہرہ ہونا چاہیے۔ متعدد مغربی ملکوں میں بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں کی انجمنوں کو اپنے دستخطوں سے احتجاج نامے شائع کرانے چاہئیں، اور مشاعروں کا انعقاد ہونا چاہیے۔

وہ دھیمی دھیمی احتجاجی آوازیں جو اس وقت ہمارے ماحول میں گونج رہی ہیں۔ یہ تو محض شرط پوری کرنے کی صورت ہے۔ احتجاج تو وہی ہو گا جو قصرِ استبداد کو ہلا دے۔ اور آئندہ کوئی ملک مسلم اقلیت کو اذیت دینے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس سلسلے میں روزنامہ دعوت دہلی کی ایک رپورٹ سے اخذ کردہ معلومات بھی پیشِ خدمت ہیں :-

۱۔ برما کے ۲½ لاکھ سے زائد مسلمان بنگلہ دیش کے سرحدی علاقے میں قائم کردہ عارضی کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۲۔ دس لاکھ سے زائد پناہ گزیں اراکان کے پُرپیچ دگھنے جنگلات میں چھپتے پھر رہے ہیں۔

۳۔ جنرل نے ون کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی موجود ہے۔

۴۔ ۱۹۳۸ء میں وہاں فرقہ وارانہ فساد ہوا جس کے نتیجے میں اراکان کے مسلمانوں نے مجاہد تحریک چلائی جو ۱۹۶۴ء میں ختم ہو گئی۔

۵۔ موجودہ قضیہ حکومت برما کے اس مطالبے سے شروع ہوا کہ مسلمانوں کو برمی رسم و رواج اختیار کرنے چاہئیں اور قومی دھارے میں شامل ہو جانا چاہیے۔ مگر قومی دھارے کے

معنی بودھ رسوم ہی تھے۔ مسلمانوں کے لیے مشکل تھی کہ وہ حکومت کی خوشنودی کے لیے اپنے تہذیبی ورثہ کو خیرباد کہہ کر برمی ازم یا بودھ رسوم کو اختیار کرلیں۔

۶۔ برمی رسوم ورواج اختیار نہ کرنے کی وجہ سے ان کے لیے عیدالاضحیٰ پہ قربانی دینا ممنوع ٹھہرایا گیا۔ اسلامی تقریبات پر سرکاری تعطیلات ختم کردی گئیں۔ حج پہ پابندی لگادی گئی (چنانچہ اس سال برما کا کوئی بھی شخص حج کے لیے نہیں گیا) جنرل نے وہاں کے مسلمانوں کو اپنے نام بدلنے پر مجبور کیا۔ مسلمان اس حکم کی تعمیل نہ کرسکے۔ چنانچہ انہیں برمی شہریت سے محروم کردیا گیا، ان کے مکان چھین کر دیگر افراد میں تقسیم کردیے گئے۔

۷۔ مسلمانوں کو برمیانے کی اس تحریک سے قبل جنرل نے ون کی حکومت مسلمانوں کو برما کا شہری سمجھتی تھی، چنانچہ قومیتوں کی کونسل میں مسلمانوں نے اپنے نمائندے چن کر بھیجے۔

۸۔ برما کی اقتصادی زندگی پہ مسلمانوں کے اثرات بہت گراں گذرنے لگے تھے۔ اس کا ردعمل بھی کام کررہا ہے۔

---

(۳)

فرد ہو، جماعت ہو، قوم یا تہذیب، حکومت یا قیادت ہو، ہر ایک کی اجل مسمّٰی ہوتی ہے اور اس اجلِ مسمّٰی کا تعین اعمال سے ہوتا ہے، جیسے کہ قوموں کو مہلت کا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ

حکومتوں کا معاملہ تو خاص طور پر نازک ہوتا ہے ؎

سلطنت نازک تر آمد از حباب
از دمے او را تواں کردن خراب

خصوصاً جب کوئی حکومت کسی وقتی ضرورت کے تحت اوپر ہی اوپر سے نمودار ہوئی ہو اور جس کی خود اپنی نگاہ میں بھی اس کا وجود عبوری ہو۔ ہمارے ہاں پہلے بھی مارشل لاء لگتے رہے ہیں،

مگر اس دفعہ پہلا مارشل لا ایسا لگا ہے کہ جس نے عوام سے خراج محبت و تحسین وصول کیا - لیکن قابلِ غور یہ امر ہے کہ آیا عوام کے جذبات اپنے اُسی معیار پر جوں کے توں قائم ہیں ؟ زیادہ زور پر آگئے ہیں ؟ یا پہلے سے دھیمے ہو رہے ہیں ؟ اس سوال کے جواب میں ہماری موجودہ عبوری حکومت اندازہ کر سکتی ہے کہ اس کی اجل مسمیٰ کتنی دُور یا قریب ہے ؟

تاریخ پڑھ کر دیکھیے ، حکومتیں اور قیادتیں اور جماعتیں اس سوال پر اوّل تو غور ہی نہیں کیا کرتیں ، اگر کبھی اِدھر توجہ ہو بھی تو وہ خود فریبی میں مبتلا رہتی ہیں اور یہ من گھڑت رائے قائم کر کے مطمئن ہو جاتی ہیں کہ سب اچھا ہے - یہ حساب لگانا کہ خود اُن کی پوزیشن میں کیا تبدیلی آچکی ہے ؟ مسائل و احوال کونسی اچھی یا بُری شکل اختیار کر رہے ہیں اور عوامی رجحانات کی جنبش کرتی ہوئی سوئی آیا خوش آئند مثبت سمت کی طرف بڑھ رہی ہے یا ناپسندیدہ منفی جانب - نتیجہ یہ کہ اجل مسمیٰ نوامیسِ الٰہی کے تحت یکایک تقدیر کا فرمان لیے داخل ہوتی ہے اور اس فرمان کو رد کرنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا - جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے وہ اس کے صدور سے پہلے کیا جا سکتا ہے ، بعد از وقت کوئی مہلت نہیں ملا کرتی -

پس اصحابِ حکومت اور اربابِ قیادت کو کتنا چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے ، ورنہ ؎

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد

اب چند ایسے بدیہی اُمور کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی درست یا نادرست صورت میں واقع ہونے سے مہلتِ کار میں اضافہ یا کمی واقع ہو سکتی ہے -

کسی بھی حکومت کے سامنے یہ طے شدہ نقشہ موجود ہونا چاہیے کہ اُسے کتنے وقت میں کیا کیا ضروری کام لازماً انجام دینے ہیں اور کن کن خرابیوں کا کس ترتیب سے انسداد کرنا ہے - یہ نقشہ ہی اگر رومانوی یا انتہا پسندانہ یا اپنے ظرفِ استطاعت سے زیادہ بڑا ہو تو منصوبہ پورا نہ ہو سکے گا - اور نقشہ اگر اپنی جگہ درست ہو ، لیکن عملاً اس کے مطابق کام نہ کیا جا سکے تو صاف بات ہے کہ اقتدار کی گو دو چوگاں میں بازی مات ہونے کا خطرہ ہے - اس بنیادی اور وسیع الاثر کوتاہی کا ازالہ لوگوں

کے سامنے وضاحتیں اور معذرتیں کرنے سے نہیں ہوسکتا، کیونکہ نوامیسِ قدرت اپنا کام ریاضیاتی اور مشینی طریقہ سے کرتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کسی بھی حکومت کو اپنے سلوگن، اپنے عقیدے اور نظریے اور اپنے اعلان کردہ پروگرام کو ملحوظ رکھ کر یہ امر بھی دوٹوک طریق سے طے کرلینا چاہیے کہ اسے اپنا کام صحیح طریق سے کرنے کے لیے کیسے لوگ چاہئیں، کن اوصاف کے افسر اور کن صلاحیتوں کے کارکن۔

آپ کو اگر مسجد کا انتظام چلانے کے لیے کوئی کمیٹی بنانی ہو تو اس میں اگر زنا و اغوا کے رسہ گیروں، اسمگلروں، سودخوروں، الحادپسندوں اور مفادپرست منافقوں کو جمع کردیں گے تو وہ مسجد کی آبادکاری کے بجائے اس کی تباہ کاری کا کارنامہ انجام دیں گے۔ اسی اصول پر کسی بھی درجے کی اسلامی حکومت چلانے کے لیے ایک خاص طرح کے لوگ درکار ہیں، اور ایک خاص طرح کے لوگوں کو دُور ہٹا کے رکھنا چاہیے۔ ورنہ کارکنوں میں اگر اسلام کے مخالفین اور اُن کے ساتھ اسلام ناآشنا افراد کو جمع کر لیا جائے تو نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ اُوپر سے آپ اسلام اسلام پکارتے رہیں اور نیچے اسلام کی جڑیں آپ ہی کے کارندے کھود رہے ہوں۔

یہ ضروری نہیں ہوتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی سیکرٹریٹ، کسی محکمے یا کسی دفتر کے سوفیصد افراد ڈھب کے ہوں۔ نہیں، ان میں سے ایک جاندار اقلیت ایسی تلاش کرکے اس کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کارپردازنہ بنا دینا چاہیے اور اسی کو افراد اور روزمرّہ کام اور مصارف کا نگران بھی ہونا چاہیے جو اسلام کے لیے مخلص، پاکستان کے محب اور کردار کے لحاظ سے بے رخنہ ہو۔

یہ کام اگر نہ ہوسکے تو پھر بیوروکریسی کے بڑے افسر اور چھوٹے کارکن مل جل کر ایک ایسی آہنی دیوار بن جاتے ہیں جس کے ایک طرف حکمران قوت ہوتی ہے اور جس کے دوسری جانب عوام پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان سیدھا سیدھا رابطہ باقی نہیں رہتا۔ اسی رابطے کو قائم رکھنے کے لیے سیاسی پارٹی کا ہونا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایک طرف حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھالتی ہے اور دوسری طرف عوام سے رابطہ رکھتی ہے۔

مجھے ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اس پہلو سے میں حالات کا جائزہ لے کر اپنی کوئی رائے دوں۔ مفید اور مؤثر صورت یہی ہے کہ خود حکمران قوت ہی اس مسئلے پر غور کرے، حالات کو سمجھے

اور اپنی راہ عمل میں جیسی تبدیلی ضروری ہو کرے۔

کسی بھی حکومت و قیادت کی قوت کا ایک راز اُن وعدوں کے صحیح اور بر وقت ایفا میں مضمر ہے جو پبلک سے استوار کیے جاتے ہیں۔ ان مواعید کو اگر پورا نہ کیا جائے، یا غلط طریق سے پورا کیا جائے، یا انہیں بے جا طور پر التوا میں ڈال جاتا رہے تو ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔

مثلاً بحالاتِ موجودہ پبلک کے سامنے حکومت کے جو مواعید موجود ہیں ان میں سے چند یہ ہیں: (۱) اُردو زبان کی بہ حیثیت قومی زبان کے ہر سطح پر اور ہر دائرے میں ترویج۔ (۲) اسلامی قوانین کا نفاذ اور عدالتوں کا یہ اختیار پالینا کہ وہ کسی بھی سامنے آنے والے قانون کے متعلق فیصلہ کر سکیں کہ وہ اسلامی ہے یا نہیں۔ (۳) موجودہ نظام تعلیم کو بدل کر ایسا نظام تعلیم تشکیل دینا کہ جس میں مرکزیت اسلامی ایمان و اخلاق، اسلامی قانون، اسلامی تاریخ اور اسلامی شخصیتوں کو حاصل ہو اور جس کا مقصد مسلم لیڈروں، مسلم انجینیئرز، مسلم ڈاکٹرز، مسلم قانون دانوں، مسلم معلّمین، مسلم افسران اور ملازمین، مسلم ایڈمنسٹریٹروں، مسلم ماہرین اقتصادیات، مسلم ادیبوں اور صحافیوں اور مسلم شہریوں، مزدوروں، کسانوں اور دوٹروں کو تیار کر کے معاشرے کو بہم پہنچانا ہو۔

حکومت کی طرف سے ایک سے زائد بار دہرایا ہوا یہ وعدہ بھی سب کے سامنے ہے کہ پاکستان میں مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے لیے قدم اوّل کے طور پر دو ایک شہروں میں خواتین یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

بنگلہ دیش میں انتہا درجے کی خستہ حالی کے شکار جو غیر بنگالی تباہی کے کیمپ میں پڑے ہیں۔ ان سب کا استحقاق ہے کہ پاکستان میں انہیں پناہ حاصل ہو۔ لیکن ۲۵ ہزار افراد کو منتقل کرنے کا تو صریح وعدہ کیا جا چکا ہے۔ اس وعدے پر گذرنے والی مدت حکومت کی مقبولیت پر اثر ڈال رہی ہے۔

حکومت کی طرف سے یہ وعدہ بھی ہمارے سامنے ہے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ہوا ہے کہ مہیٹو دَور میں قومی اتحاد کے کارکنوں کو جو سزائیں دی گئی تھیں یا اُن کے خلاف جو مقدمات چلائے گئے تھے وہ کالعدم قرار دیے جائیں گے۔ بدقسمتی سے آج بھی قومی اتحاد کے کارکنوں کی ایک تعداد سزائیں بھگت رہی ہے، اور بہت سے لوگوں کے خلاف پرانے فائیلوں سے فراموش شدہ مقدمات پھر لائے جا رہے ہیں اور کئی نوجوان

پیشیاں بھگت رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ کام ایک اعلان یا فیصلے کے تحت ایک دن میں سرانجام نہیں پا سکتا ؟ کیوں نہیں پا سکتا ؟ اس میں اگر جیل یا پولیس کا عملہ رخنہ انداز ہو تو اسے انتباہ ملنا چاہیے کہ اگر ایسی کوئی سزا یا ایسا کوئی مقدمہ آج کے بعد حکومت کے نوٹس میں آیا تو متعلقہ افراد کو سزا ملے گی۔ میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ ایک کام کے کرنے کا فیصلہ ہے اور پھر وہ سرانجام نہ پا سکے۔ معاملہ مؤثر تدبیروں کے اختیار کرنے اور قطعی اقدامات کرنے کا ہے، اور بس !

بیوروکریسی کے ماہرین اور حکمران اور عوام کے درمیان حائل ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو اصل حکومت وہ خود کرتے ہیں۔ اپنا خیال حکمران کے دماغ میں اور اپنی بات اس کے منہ میں اس طرح ڈال لیتے ہیں کہ اُلٹا انہیں شکر حاصل ہوتا ہے۔ جس کے سر پر سرداری ہے اسے حالات سے آگاہ ہی نہیں ہونے دیتے کہ وہ موافق جا رہے ہیں یا مخالف۔ دُور اندیش حکمران اس خطرے سے بچنے کے لیے ایک چیز پر سختی سے عمل کرتے ہیں، وہ یہ کہ تمام کاغذات اور فائیلوں کو ان کی نظر سے گذرنا چاہیے۔ کام زیادہ ہو تو وہ اپنے اعتماد کے قریب ترین رفقاء میں سے جن کا تعلق بیوروکریسی سے نہ ہو دو ایک کا تعاون حاصل کر لیتے ہیں۔

بہت بڑی چیز جس کا خیال رکھنا لازم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کی شکایات اور تکالیف اور انہیں پیش آنے والی بے انصافیوں کا ازالہ ہو۔ اسی طرح رائے عام کو شدید طور پر متاثر کرنے والی ایک چیز جرائم کی کثرت ہے جو حالتِ امن کو ختم کر کے ہر کسی کو حالتِ خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اگر شکایات اور تکالیف کی بیلیں ہر طرف پھیل کر ایک ایک شہری کے گلے اور ہاتھوں اور پاؤں پر لپٹ جائیں اور ان میں نیچے ہی نیچے اضافہ ہوتا رہے تو کسی بھی حکومت کی مہلتِ کار میں تیزی سے کمی آنے لگتی ہے۔ اسی طرح مثبت سمت میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ باشندگانِ ملک کی تعلیمی، دینی، سوشل اور ثقافتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ٹھوس اور نمایاں اقدامات کیے جائیں۔ اور اس فلاحی و تعمیری مہم کا قدم ہر روز آگے کی طرف

بڑھتا جائے۔ اس مثبت پہلو سے بھی اگر جمود طاری ہو جائے یا انتہائی سست روی پیدا ہو جائے تو بھی اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ حکومت —— خصوصاً انقلابی یا عبوری حکومت وہی کامیاب ہوتی ہے جو ہر صبح کو کسی نہ کسی نئے اقدام کا پیغام دے، اور ہر شام کو عوام کو کسی نئی خدمت کا تحفہ پیش کر سکے۔ معاملہ کچھ بین اور سانپ کا سا ہے۔ بین کی آواز اور سپیرے کے جھومتے سر کی جنبشیں جہاں ذرا رکیں، فوراً سانپ حملہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح حکومتیں بھی عوام کو مداریوں کی طرح ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے نئے شعبدے میں اتنا منہمک رکھتی ہیں کہ اُن کے ذہن کو حکومت کے خلاف کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

متذکرہ صورتیں اگر حسب مراد نہ جا رہی ہوں تو حکومت کے حامی عناصر جن کی تائید اُسے مسند پہ بیٹھنے کی سند جواز دیتی ہے، کچھ ڈھیلے ہونے لگتے ہیں۔ اوّل اوّل وہ حکمران قوت کے اقدامات کی پُرزور تائید کرتے ہیں، پھر جب حالات بہتری کی طرف نہ بڑھ سکیں تو وہ معترضین اور سائلوں کا من گھڑت توجیہات سے منہ بند کرتے ہیں، لیکن اس سے بھی معاملہ گذر جائے تو پھر وہ مخالفین کے مقابلے میں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ان کو مضبوط اور مطمئن رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ قوم کے تمام طبقات و عناصر کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کرنا اچھا آئیڈیل تو ہے، مگر عملاً سب کو راضی رکھنے کی کوششوں سے سب راضی بھی نہیں ہوتے، اور جو مخلص حامی بھرپور تائید کرتے رہتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ پیچھے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی حکومت کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اصلی مخلص حمایتیوں کو جانے پہچانے اور اُن کی تسکین کا سامان کرے اور سب کو اپنانے کی کوشش میں ان کو ہاتھوں سے گنوا نہ دے۔

بہت گہرا جذبۂ خیر خواہی ہے جس کے تحت یہ سطور لکھی گئی ہیں۔ کوئی ان کو پڑھ کر غور کرے تو بڑی بات ہے، یہ کسی کے لیے درخورِ اعتنا ہی نہ ہوں تو اپنا کوئی دعویٰ تو ہے نہیں!

اپنا مقصد دین، ملت، ملک، سیاسی کارپردازوں اور جمہور کی بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں۔